تفسیر
سورۃ مرسلات

سُورَةُ الْمُرْسَلٰتِ

مَكِّيَّةٌ ـــــــــــ اٰيات: ۵۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا ۝۱ فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا ۝۲ وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا ۝۳ فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ۝۴ فَالْمُلْقِيٰتِ ذِكْرًا ۝۵ عُذْرًا اَوْ نُذْرًا ۝۶ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَوَاقِعٌ ۝۷ فَاِذَا النُّجُوْمُ طُمِسَتْ ۝۸ وَاِذَا السَّمَآءُ فُرِجَتْ ۝۹ وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ ۝۱۰ وَاِذَا الرُّسُلُ اُقِّتَتْ ۝۱۱ لِاَيِّ يَوْمٍ اُجِّلَتْ ۝۱۲ لِيَوْمِ الْفَصْلِ ۝۱۳ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الْفَصْلِ ۝۱۴ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝۱۵

قسم ہے ان کی کہ چھوڑدی جاتی ہیں، پھر خاک اڑاتی ہیں اور پھیلاتی ہیں، پھر پھاڑتی ہیں۔ پھر یاد دلاتی ہیں، الزام اتارنے کو یا ڈر سنانے کو، کہ جو تم سے وعدہ کیا گیا ہے ضرور پورا ہو کے رہے گا۔ جب کہ ستارے چھپ جائیں گے اور آسمان پھٹ جائے گا، اور پہاڑ اڑیں گے اور رسول کے لیے وقت مقرر ہو گا۔ کس دن پر یہ ٹالے گئے ہیں؛ فیصلہ کے دن پر۔ اور فیصلہ کے دن کو تو کیا سمجھا، اس دن منکروں کی خرابی ہے۔

۱۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے اس کا تعلق

قرآن کی آخری سورتوں میں بیشتر ابتدائے دعوت کے بنیادی مسائل کا بیان ہے، یعنی قیامت، خشیت اور احسان کا۔ چنانچہ اس سورہ کا عمود بھی یہی تین چیزیں ہیں۔ اور یہی تین ابتدائی نقطے ہیں جو پھیل کر بالآخر دین کے تمام اجزا کو اپنے دائرہ میں سمیٹ لیتے ہیں۔ قیامت کا ڈر، ایمان بالقرآن کی اصل ہے، کیونکہ قرآن کا سب سے زیادہ

نمایاں پہلو یہی ہے کہ وہ عدل و جزا اور ایک خوفناک دن کے ظہور کی منادی ہے۔ خشیت الٰہی نماز اور توحید کی اصل ہے اور تیسری چیز یعنی خلق خدا کے ساتھ احسان، تمام قوانین و شرائع کی بنیاد ہے۔

یہ تمام باتیں قرآن مجید میں اپنے اپنے موقع سے، نہایت تفصیل و وضاحت کے ساتھ بیان ہوئی ہیں اور اس سورہ میں بھی، حسب اقتضائے موقع، مختلف اسلوبوں سے ان کا ذکر آیا ہے اور موقع کی تبدیلی کے ساتھ اسلوب کی تبدیلی قرآن مجید کی ایک خاص خصوصیت ہے، جس سے اہل نظر ناواقف نہیں۔ قرآن مجید نے اپنی اس خصوصیت کی طرف خود اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے: وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا (اور ہم نے اس قرآن میں باتیں مختلف اسلوبوں سے بیان کی ہیں تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔

اسی اصول پر اس عام عمود کے مختلف حصے مختلف سورتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ کسی میں کوئی پہلو نمایاں ہوا ہے، کسی میں کوئی، اور اسی لحاظ سے طرز خطاب بھی بدل بدل گیا ہے۔ کبھی فکر و احساس کو بیدار کیا گیا ہے اور کہیں عقل اور دل کو دعوت دی گئی ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ان سورتوں میں دلائل کے ساتھ ترغیب و ترہیب بھی حسب اقتضائے بلاغت مختلف شکلوں اور صورتوں میں نظر آتی ہے۔

اس معاملہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس سورہ کو سابق سورہ کے ساتھ ملا کر پڑھو۔ سابق سورہ، (سورہ دہر) میں معاد، قرآن اور نماز کا ذکر ہوا تھا۔ غور سے دیکھو تو اس سورہ میں بھی انہی چیزوں کا بیان ہوا ہے لیکن اسلوب بیان بدل گیا ہے۔ سابق سورہ میں جو پہلو مجمل رہ گئے تھے اس سورہ میں وہ پہلو تفصیل کی روشنی میں آ گئے ہیں۔ سابق سورہ میں معاد پر جو استدلال تھا، صرف چند لفظوں میں تھا، اس سورہ میں وہ تفصیل کے ساتھ ہے۔ سابق سورہ میں معاد کی تصویر کے لیے ترغیب کا پہلو زیادہ نمایاں کیا گیا تھا۔ اس سورہ میں زیادہ زور ترہیب کے پہلو پر ہے۔ اور انذار و تبشیر دونوں کے ساتھ ساتھ اور مساوی رکھنے کے لیے ایسا کرنا تقاضائے بلاغت اور مصلحت دعوت کے عین مطابق ہے۔ خدا کے انبیاء ایک ہی ساتھ بشیر و نذیر دونوں ہوتے ہیں۔ وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ (اور ہم اپنے رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر خوشخبری دینے والا اور آگاہ کرنے والا بنا کر)

یہ اجمالی اشارات ہیں۔ ان دونوں سورتوں پر اگر پوری طرح تدبر کیا جائے تو ہم نے جن امور کا ذکر کیا ہے وہ اچھی طرح واضح ہو سکتے ہیں۔

۲۔ سورہ کے مواقع ترجیع سے متعلق ایک اصولی بحث

یہ سورہ ترجیع والی سورتوں میں سے ہے۔ اس میں وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ کا فقرہ دس مرتبہ دہرایا گیا ہے۔ اس اسلوب کی خصوصیات پوری تفصیل کے ساتھ سورہ رحمٰن میں بیان ہو چکی ہیں۔ یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ صرف ایک خاص امر کی طرف ہم یہاں اشارہ کرنا چاہتے ہیں وہ یہ کہ ترجیع کی خوبی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے مواقع کے لحاظ سے نہایت بامعنی اور پوری طرح موزوں ہو اور جو بات اس سے اوپر بیان ہوئی ہے اس سے پورا پورا لگاؤ رکھتی ہو۔

اس اعتبار سے ترجیع کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ مختلف پہلوؤں کی جامع ہو تاکہ مختلف مطالب کے ساتھ لگ سکے۔ چنانچہ یہ آیت (وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ) اپنے اندر مختلف پہلو رکھتی ہے۔ اور اسی وجہ سے مختلف مواقع کے لیے ٹھیک ٹھیک موزوں ہو گئی ہے۔ اس کے اسلوب اور اس کے تین لفظوں میں کافی وسعت ہے۔ ذیل میں ہم اس کے بعض پہلوؤں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ا۔ اس کا اسلوب ایسا ہے کہ اس میں انشاء اور خبر دونوں ہونے کی صلاحیت اور دونوں کا احتمال موجود ہے۔ خبر یہ اسلوب کا مقصد یا تو اس امر کا بیان ہوگا کہ ان منکرین کے لیے ہلاکت اور خرابی ثابت ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ۔ (البقرہ - ۷۹)

پس ان کے لیے خرابی ہے اس چیز کے باعث جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور اس کے سبب جو وہ کماتے ہیں۔

یا ان کے اس قول کا بیان مقصود ہے جو وہ قیامت کے دن کہیں گے۔ ان کا یہ قول قرآن مجید میں مختلف جگہ نقل ہوا ہے۔ مثلاً قَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ[1] دوسری جگہ ہے۔ قَالُوْا يٰوَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا[2]۔

لفظ وَيْل کی بار بار تکرار میں بھی ایک خاص راز ہے۔ اگر اس سے محض یہ مفہوم لیا جائے کہ ان کے لیے خرابی کا بیان ہے تب تو اس تکرار کا یہ فائدہ ہوگا کہ اس سے اسباب ویل کی کثرت واضح ہو گی اور اگر یہ قیامت کے دن ان کے قول کی نقل ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس دن اس کے بہت سے مواقع پیش آئیں گے اور وہ ہر موقع پر اپنی بدبختی کا ماتم کریں گے۔ بعض آیات سے اس مفہوم کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً فرمایا:۔

وَاِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ ثُبُوْرًا لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا كَثِيْرًا۔

اور جب وہ ڈال دیے جائیں گے اس کی کسی تنگ جگہ میں باندھ کر، پکاریں گے اس وقت ہلاکی کو، آج ایک ہی ہلاکی کو نہ پکارو، بہت سی ہلاکیوں کو پکارو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اس دن ہلاکت کے اسباب اور مواقع دونوں ہی بے شمار ہوں گے۔

ب۔ لفظ ویل خود ایک جامع لفظ ہے۔ وہ تمام چیزیں اس کے تحت آ گئیں جو خرابی کا سبب ہو سکتی ہیں، غم، حسرت، پریشانی، عذاب قیامت، ہر چیز پر یہ حاوی ہے۔ بعض جگہ قرآن مجید میں اس چیز کی تصریح کر دی جاتی ہے، جو ویل کا سبب ہوگی۔ مثلاً وَوَيْلٌ لِّلْكٰفِرِيْنَ مِنْ عَذَابٍ شَدِيْدٍ (اور خرابی ہے کافروں کے لیے عذاب سخت کے سبب سے) دوسری جگہ ہے: فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ (پس خرابی ہے ان کے لیے اس چیز کے باعث جو ان کے ہاتھوں نے لکھا اور اس چیز کے سبب جو وہ کماتے ہیں۔ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ۔ (پس ہلاکی ہے کافروں کے لیے ان کے اس دن کے سبب جس کا ان سے وعدہ کیا جا رہا ہے)

الغرض لفظ ویل کسی خاص امر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، اوپر یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ چونکہ اس کے اسباب بہت ہوں گے، اس لیے اس کے مواقع بھی بہت سے آئیں گے۔

---

[1] وہ کہیں گے ہائے ہماری بدبختی! یہ تو قیامت کا دن ہے۔ [2] وہ کہیں گے ہائے ہماری بدبختی ہم کو ہماری قبروں سے کس نے اٹھایا۔

ج۔ 'یَوْمَئِذٍ' کا لفظ ان تمام چیزوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جس دن ایسا ایسا ہوگا، پس اس کے حدود کی تعیین موقع کے لحاظ سے ہوگی۔

د۔ 'مُکَذِّبِیْن' کا لفظ ایک جامع لفظ ہے۔ اصلاً یہ حشر و نشر اور آیات توحید کے انکار کے لیے آیا ہے لیکن تفصیلات میں رسول اور کتاب اللہ کی تکذیب بھی اس میں داخل ہے۔ قرآن مجید نے جا بجا ان تمام پہلوؤں کی تصریح کر دی ہے۔ اور بعض آیات میں اس امر کو بھی واضح کر دیا ہے کہ جو اصل کا منکر ہوگا وہ لازماً اس کے فروع اور تفصیلات کا بھی منکر ہوگا۔ مثلاً فرمایا:

وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَیْنَکَ وَبَیْنَ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَۃِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا وَّجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِھِمْ اَکِنَّۃً اَنْ یَّفْقَھُوْہُ وَفِیْٓ اٰذَانِھِمْ وَقْرًا وَاِذَا ذَکَرْتَ رَبَّکَ فِی الْقُرْاٰنِ وَحْدَہٗ وَلَّوْا عَلٰٓی اَدْبَارِھِمْ نُفُوْرًا۔ (الاسراء۔ ۴۵-۴۶)

اور جب تم قرآن سناتے ہو تو ہم ڈال دیتے ہیں تمہارے درمیان اور ان کے درمیان جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ایک پوشیدہ پردہ اور ڈال دیتے ہیں ان کے دلوں پر غلاف کہ اس کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بہرا پن پیدا کر دیتے ہیں اور جب تم قرآن میں اللہ کو تنہا ذکر کرتے ہو تو یہ نفرت کے ساتھ پیچھے بھاگتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ چونکہ وہ قیامت اور توحید کے منکر ہیں اس وجہ سے لازماً اس چیز کا سننا بھی ان پر شاق ہے جو ان چیزوں کی طرف ان کو دعوت دیتی ہے۔

یہاں یہ اجمالی اشارہ کافی ہے۔ اپنے مقام پر پورے شرح و بسط کے ساتھ اس کی تفصیل موجود ہے۔

اس روشنی میں آیات ذیل کا ظاہری اشارہ تو منکرین قیامت ہی کی طرف ہوگا۔ لیکن سورہ کی آیات اس کے ایک اور پہلو تکذیب قرآن کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے۔ اور حقیقت کے اعتبار سے ان دونوں میں صرف اجمال و تفصیل کا فرق ہے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ آیت ترجیع کے متعدد پہلو ہیں۔ پس سیاق و سباق سے جو پہلو زیادہ لگتا ہوا ہوگا، اختیار کر لیا جائے گا۔ یہ اصولی بحث بطور مقدمہ ذہن نشین رکھنی چاہیے۔ ہم آگے موقع موقع کے اعتبار سے آیت کے مختلف پہلوؤں میں سے جو پہلو اقرب ہوگا اس کو بیان کر دیں گے۔

۳۔ لفظوں کی تفسیر اور بعض جملوں کی تاویل

(۱ - ۱۵)

وَالْمُرْسَلٰتِ عُرْفًا عربی میں 'اَرْسَلَ الشَّیْءَ' 'اَمْسَکَہٗ' کا ضد ہے۔ 'ارسل الشئ' کے معنی ہوئے، کسی بندھی ہوئی چیز کو چھوڑ دیا، آزاد کر دیا۔ ہوا رکی ہوتی ہے تو گویا بندھی ہوئی ہے۔ جب چلنے لگی تو گویا چھوڑ دی گئی، فرمایا، وَاَرْسَلْنَا الرِّیٰحَ لَوَاقِحَ (اور ہم نے ہواؤں کو اٹھایا بوجھل بنا کر)

عُرْف نَاصِیَۃُ الْفَرَسِ گھوڑے کی ایال کے وہ بال جو پیشانی پر لٹکے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ ایک عام اور مشہور لفظ

ہے۔ امراء القیس کا شعر ہے،

نمش باعراف الجیاد اکفنا اذا نحن قمنا عن شواء مضھب

(جب شکار کا کچا پکا گوشت کھا کر اٹھتے تھے تو گھوڑوں کی ایال میں ہم اپنے ہاتھ پونچھ لیتے تھے)

یہاں ہواؤں کو گھوڑوں سے اور ان کے چلنے اور رکنے کو گھوڑوں کی پیشانی کے بال پکڑنے اور چھوڑنے سے تشبیہ دی ہے۔ اس تشبیہ سے اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے کہ ہواؤں کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ تعالیٰ کے امر و حکم سے ہوتا ہے، وہی مالک اور متصرف ہے (وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ اِلَّا ھُوَ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِھَا) نہیں ہے کوئی جاندار مگر وہ اس کی پیشانی پکڑے ہوئے ہے)

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ہواؤں کا چلنا اپنے اندر فائدہ اور نقصان دونوں کے پہلو رکھتا ہے۔ قرآن مجید نے اس کی تصریح کر دی ہے۔

محض ارسال کا لفظ شدت کے اظہار کے لیے کافی نہ تھا، اس وجہ سے 'عاصفات' کو اس حرف کے ذریعہ عطف کیا۔

فَالْعٰصِفٰتِ عَصْفًا یعنی چلنے کے بعد سخت ہو جاتی ہے، ایسی ہوا عموماً نقصان پہنچانے کے لیے ہوتی ہے۔

حَتّٰٓی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْکِ وَجَرَیْنَ بِھِمْ بِرِیْحٍ طَیِّبَۃٍ وَّفَرِحُوْا بِھَا جَآءَتْھَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَھُمُ الْمَوْجُ مِنْ کُلِّ مَکَانٍ۔ (یونس۔ ۲۲)

یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ ان کو لے کر چلتی ہیں موافق ہوا کے ساتھ اور وہ اس سے خوش ہوتے ہیں۔ چلتی ہے ان پر تند ہوا اور گھیر لیتی ہیں موجیں ہر طرف سے۔

وَّالنّٰشِرٰتِ نَشْرًا نشر کے معنی ہیں کسی چیز کو پھیلا دینا، چھینٹ دینا، برانگیختہ کر دینا، اگا دینا۔ یہ سب معنی قریب قریب ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ مختلف مواقع پر مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ ہے، وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ (جب کہ اعمال نامے کھولے جائیں گے) دوسری جگہ ہے وَھُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَہٗ (اور وہی ہے جو اتارتا ہے بارش، بعد اس کے کہ وہ مایوس ہو جاتے ہیں اور پھیلاتا ہے اپنی رحمت) ایک جگہ فرمایا وَجَعَلَ النَّھَارَ نُشُوْرًا (اور دن کو اٹھنے کا وقت بنایا) یہاں ناشرات سے ہوائیں مراد ہیں۔ اس لیے کہ ان میں نشر کے مختلف پہلو پائے جاتے ہیں۔ یہ بادلوں کو ابھارتی ہیں، پھر ان کو فضا میں پھیلاتی ہیں، پھر اپنے رب کی رحمت کو چھینٹتی ہیں اور نباتات کو اگا کر زمین کو سرسبز و شاداب بناتی رہتی ہیں اور چونکہ یہ مستقل وصف تھا، عصف کا نتیجہ نہ تھا اس لیے حرف عطف واؤ آیا۔

فَالْفٰرِقٰتِ فَرْقًا ہوائیں فرق و امتیاز کرتی ہیں۔ یعنی کبھی بارش کو لاد کر لاتی ہیں، کبھی بادلوں کو اڑا کر لے جاتی ہیں۔ کسی قوم کو نفع پہنچاتی ہیں، کسی کو ضرر۔ سورۂ ذاریات میں ہواؤں کے ان تصرفات کو آیت 'فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا' کے تحت میں ہم بیان کر آئے ہیں۔ چونکہ یہ فرق و امتیاز نشر کے بعد نمایاں ہوتا ہے اس وجہ سے عطف 'ف' کے ذریعہ سے ہوا۔

فَالْمُلْقِیٰتِ ذِکْرًا قرآن مجید میں اکثر جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ ہواؤں کی گردش میں، اللہ تعالیٰ کی نشانی اور یاد دہانی ہے۔ اسی سببیت کے تعلق کی وجہ سے، عام قاعدہ کے مطابق، فعل کی نسبت ہواؤں کی طرف کر دی ہے۔ جس

طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا میں اضلال، کی نسبت اصنام کی طرف کردی گئی ہے۔

وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِنَ النَّاسِ ۔ (ابراهیم - ۳۶)

اور مجھ کو اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بت پوجنے لگیں۔ میرے پروردگار ان بتوں نے لوگوں میں سے ایک خلق کثیر کو گمراہ کر رکھا ہے۔

پس ہواؤں کی گردش کے بعد اس امر کو یاد دلایا کہ ہوائیں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے قانون قضا بالحق کا اعلان کرتی ہیں۔

عُذْرًا أَوْ نُذْرًا | یعنی یہ یاد دہانی جو ہواؤں کی گردش کے ذریعے سے ہوتی ہے اس کا مقصد غافلوں پر اتمام حجت اور ہوشیاروں کو انذار کا پیام پہنچانا ہے۔ 'أوْ' یہاں تقسیم کے لیے ہے۔ قرآن مجید میں ایک جگہ مصلحین کا قول نقل ہوا ہے اس میں اس مفہوم کی تصریح ہوگئی ہے۔

وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ۔ (الاعراف - ۱۶۴)

اور جب کہ کہا ان سے ایک گروہ نے تم کیوں نصیحت کرتے ہو ایسے لوگوں کو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا ہے یا سخت عذاب دینے والا ہے۔ بولے تمہارے رب کے حضور میں معذرت کے لیے اور تاکہ وہ ڈریں۔

یعنی جو لوگ ہماری باتوں کو نہ مانیں گے ان کے حق میں ہماری طرف سے یہ معذرت ہوگی اور جو لوگ سنیں گے ان کو اس سے نفع پہنچے گا۔

إِنَّمَا تُوعَدُونَ | یہ ایک عام لفظ ہے، قیامت، حشر و نشر، فیصلہ اور روز جزاء کے متعلق جو وعدے کیے گئے ہیں، وہ سب اس میں آگئے۔ قرآن مجید میں اس کی جو نظیریں ہیں ان میں جگہ جگہ ان تمام چیزوں کی تصریح کردی گئی ہے اور چونکہ ان سب کی حقیقت ایک ہی ہے، اس وجہ سے یہاں اجمال کے ساتھ ان کو ذکر کردیا۔ تفصیل نہیں فرمائی۔

طُمِسَتْ | طمس الشئ کے معنی ہیں کسی چیز کو مٹا دیا۔ اس کے تمام نشانات و آثار محو کردیے۔ مثلاً فرمایا مِنْ قَبْلِ أَنْ نَطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَىٰ أَدْبَارِهَا (قبل اس کے کہ ہم چہروں کو مٹا دیں اور ان کو ان کے پیچھے پھیر دیں)

وَإِذَا السَّمَاءُ فُرِجَتْ | اس کے نظائر متعدد ہیں۔ مثلاً وَفُتِحَتِ السَّمَاءُ فَكَانَتْ أَبْوَابًا (اور آسمان کھول دیا جائے گا اور وہ دروازہ دروازہ ہو جائے گا) نیز وَإِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ (اور جب آسمان پھٹ جائے گا) اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ آسمان جو تمہیں بالکل ٹھوس اور سپاٹ نظر آتا ہے، جس میں کوئی شگاف یا دراڑ نہیں دکھائی دیتا (وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوجٍ) (فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِنْ فُطُورٍ) باوجود اس مضبوطی اور استحکام کے تم دیکھو گے کہ خدا کے حکم سے اس میں شگاف پڑگئے ہیں۔

وَإِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ | 'نسف' کے معنی ہیں ریزہ ریزہ کردینا، منتشر کردینا، پیس دینا، جھاڑ دینا۔ اسی سے منساف اس آلہ کو کہتے ہیں جو گیہوں کو بھس سے الگ کردیتا ہے۔ قرآن مجید میں یہ لفظ کئی جگہ آیا ہے۔

وَانْظُرْ إِلَىٰ إِلَٰهِكَ الَّذِي ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا لَنُحَرِّقَنَّهُ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهُ فِي الْيَمِّ نَسْفًا ۔

اور اپنے اس دیوتا کو دیکھو جس کو تم پوجتے رہے ہو، ہم اس کو جلائیں گے پھر اس کو ریزہ ریزہ کر کے سمندر میں منتشر کردیں گے۔

دوسری جگہ ہے:

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّي نَسْفًا فَيَذَرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا ۔

اور وہ تم سے پہاڑوں کی بابت سوال کرتے ہیں، کہہ دو میرا رب ان کو ریزہ ریزہ کردے گا اور زمین کو صفاچٹ میدان کردے گا

أُقِّتَتْ | وقتت کی تبدیل شدہ صورت ہے۔ جیسے وجوہ سے اجوہ۔ توقیت کے معنی ہیں وقت متعین کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ انبیاء کے لیے وقت متعین کیا جائے گا۔ عربی میں یہ اسلوب بہت عام ہے، مثلاً بولیں گے ابلغنی خادما ارسلنی فرسا اور مطلب یہ ہوگا کہ ابلغ لی خادما وارسل الی فرسا۔ پس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ انبیاء کے لیے حاضری کا ایک وقت متعین کیا جائے گا اور اس میں ان سے ان کی امت کے متعلق سوال کیا جائے گا اور ان کی شہادتوں کے مطابق فیصلہ ہوگا۔ یہاں یہ مضمون مجمل صورت میں ہے لیکن دوسری آیتوں میں اس کی پوری تصریح ہوگئی ہے۔

أُجِّلَتْ | أَجَّلَ لَهُ۔ اس کے لیے ایک مدت ٹھہرادی، ایک وقت متعین کردیا۔ فرمایا وَبَلَغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْتَ لَنَا (ہم اس مدت کو پہنچ گئے جو تو نے ہمارے لیے ٹھہرادی تھی) اس کے اسلوب کے بارہ میں دو تاویلیں ممکن ہیں۔ ایک تو وہ تاویل اختیار کر لیجیے جو 'وقتت' کے تعلق اوپر گزر چکی ہے، یا اجلت الآجال کے معنی میں لے لیجیے۔ دونوں صورتوں میں مفہوم کے اعتبار سے کوئی فرق نہ ہوگا۔

وَمَا أَدْرَاكَ | یعنی وہ دن ایک عظیم الشان دن ہوگا۔ یہ اسلوب استفہام کبھی کبھی محض کسی چیز کی شان بڑھانے کے لیے آتا ہے اور اس صورت میں جواب سے مستغنی ہوتا ہے۔ مثلاً الْحَاقَّةُ مَا الْحَاقَّةُ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحَاقَّةُ ۔ كَذَّبَتْ ثَمُودُ وَعَادٌ بِالْقَارِعَةِ (شدنی کیا ہے شدنی، اور تمہیں کیا معلوم کہ کیا ہے شدنی، ثمود اور عاد نے کھٹکھٹانے والی کا انکار کیا)

وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ | اس آیت کے مختلف پہلوؤں کا ذکر اوپر ہوچکا ہے۔ یہاں ہم صرف مناسب مقام امور کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ٹکڑا فَإِذَا النُّجُومُ طُمِسَتْ الایۃ کا جواب نہیں ہے۔ اس کے مندرجہ ذیل وجوہ ہیں۔

۱- اس کے جس قدر نظائر ہیں ان میں معنوی تعلق کے باوجود اس کی حیثیت بالکل مستقل ہے۔

۲- اس طرح کی شرط کے موقع پر، جواب پر 'ف' آتی ہے۔ الا آنکہ جواب جملہ فعلیہ یا ظرفیہ ہو۔ مثلاً فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ فَذَٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَوْمٌ عَسِيرٌ دوسری جگہ ہے۔ يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا وَتَسِيرُ الْجِبَالُ سَيْرًا فَوَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ۔

۳- اس قسم کی شرط میں جواب محذوف ہے۔ مثلاً إِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ، يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ الایۃ اس میں جواب محذوف ہے، اس لیے کہ سیاق کلام سے خود واضح ہے۔

۴۔ ہواؤں کی شہادت اور آیات کا نظم و موقع

ہم اپنے رسالہ الامعان فی اقسام القرآن[1] میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ قسمیں مقسم علیہ پر دلیل و شہادت ہیں پس یہاں بھی ان ہواؤں کا ذکر اسی مقصد سے ہوا ہے اور یہی وجہ ہے کہ بیان میں ان کے مختلف پہلو آشکارا کیے گیے ہیں، وہ چھوڑ دی جاتی ہیں، تیز و تند ہو جاتی ہیں، بادلوں کو لاد کر لاتی ہیں۔ نباتات کو اگاتی ہیں، حیوانات کی پرورش کا سامان کرتی ہیں۔

پھر ہر سرزمین کے ساتھ ان کا معاملہ یکساں نہیں ہوتا۔ اس میں فرق و اختلاف ہوتا ہے۔ کہیں پانی برساتی ہیں تو کہیں خشک و بنجر چھوڑ جاتی ہیں۔ ایک قوم کو اپنی زرخیزیوں اور شادابیوں کی دولت سے مالا مال کر دیتی ہیں۔ دوسری کو اپنے اولوں اور بگولوں اور کڑک اور دمک کی آفتوں سے تباہ کر دیتی ہیں۔

یہ سب حالتیں اور خصوصیتیں اس لیے بیان کی گئی ہیں کہ واضح ہو کہ ان کی باگ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی قدرت و حکمت ان پر پورا تصرف رکھتی ہے۔ وہ اپنی عام حالت میں خدا کی رحمت کے لیے پیام بشارت ہیں لیکن جب وہ چاہتا ہے، ان کے ذریعہ سے ایک ظالم قوم کو ہلاک و برباد کر دیتا ہے اور دوسری مظلوم لیکن صالح قوم کو ساحلِ نجات تک پہنچا دیتا ہے۔ کبھی ان کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے اور کبھی کھینچ لیتا ہے۔

یہ تمام باتیں سورۂ ذاریات کی تفسیر میں ہم بیان کر آئے ہیں۔ اور قرآن مجید نے متعدد مواقع پر اس قدر توضیح و تفصیل کے ساتھ ان کو دہرایا ہے کہ یہاں دلائل کے نقل کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

انہی ظاہری احوال و آثار پر قرآن نے ایک عظیم الشان حقیقت کی بنیاد رکھ دی ہے۔ یعنی دنیا میں ہواؤں کے جو تصرفات ہم دیکھتے ہیں اور ان سے رحمت و عذاب، اور نفع و نقصان کے جو مظاہر ہمارے مشاہدہ میں آتے رہتے ہیں، ان ہی سے ایک روز جزاء کے وقوع پر دلیل قائم کی ہے، کیونکہ قانون جزا و سزا کی اتنی نشانیاں اور دلیلیں ان کے اندر نمایاں ہیں کہ کوئی عاقل ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ یہ خدا کی پروردگاری، اس کی قدرت، اس کی حکمت اور اس کی تدبیر کی گواہی دیتی ہیں اور واضح کرتی ہیں کہ وہ اپنے بندوں سے غافل نہیں ہے، بلکہ اس کے انعام کی بخششیں اور اس کے عذاب کے تازیانے آئے دن ان کے لیے نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ پس جب یہ سب کچھ دنیا میں ہو رہا ہے اور ہم اپنی آنکھوں سے یہ عجائب روز دیکھ رہے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے ایک دن ایسا نہ آئے جس میں ہر شخص کو اس کے اعمال کے مطابق بدلہ ملے۔

یہ جزا و سزا کے وقوع پر بنیادی دلیل ہے اور اپنی جگہ پہ پوری طرح کفایت کرتی ہے لیکن معاملہ کی ایک خاص حالت مقتضی ہوئی کہ اس کی یہاں کچھ زیادہ وضاحت کی جائے۔

کفار اپنی شدت غفلت کے باعث روز جزا کے دو وجہوں سے منکر تھے۔ ایک اس کے عجیب و غریب ہونے کی وجہ سے، دوسرے اس کی تاخیر کی وجہ سے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم بہت دنوں سے اس کی آمد کی دھمکیاں سن رہے ہیں، لیکن وہ آتی نہیں۔ پس موقع مقتضی ہوا کہ کلام کا اسلوب ایسا ہو کہ ان دونوں شبہات کا آپ سے آپ جواب نکل آئے۔

[1] اس رسالہ کا اردو ترجمہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ (مترجم)

چنانچہ پہلے شبہ کو یہاں یوں دور کیا کہ روز قیامت کی جو تفصیلات بیان فرمائیں وہ تمام تر ایسی ہیں جو ہواؤں کے فعل سے مشابہت رکھتی ہیں۔ مثلاً ہوائیں نشانات کو مٹا دیتی ہیں، آثار کو دبا دیتی ہیں۔ بادلوں کو اڑا لے جاتی ہیں، اور بسا اوقات تیز ہو جاتی ہیں تو ان کے زور سے دیواریں ڈھ جاتی ہیں، چھتیں اڑ جاتی ہیں، عالیشان عمارتیں پارہ پارہ ہو جاتی ہیں۔

یہ ہمارے آئے دن کے مشاہدات ہیں، لیکن ابھی ان کو دیکھنے کے لیے ہماری آنکھیں نہیں کھلی ہیں۔ قرآن مجید نے ان کی طرف سے اسی مقصد سے اشارہ کیا ہے کہ جو شخص ان کو سمجھ جائے گا وہ ایک ایسے دن کے ظہور کے متعلق شبہ میں نہیں رہ سکتا جس دن ستارے چھپ جائیں گے، آسمان کھل جائیں گے اور پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جائیں گے کیونکہ ہواؤں کے عجائب تصرفات میں ان کی نشانیاں موجود ہیں اور پوری طرح واضح ہیں۔

دوسرا شبہ ایک عام شبہ تھا اس وجہ سے قرآن مجید نے اس کا مختلف مواقع پر مختلف پیرایوں میں جواب دیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے:

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوْا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا۔ (فاطر۔ ۴۵)

اگر اللہ مواخذہ کرتا لوگوں کی بداعمالیوں پر فوراً، تو روئے زمین پر ایک جاندار کو بھی نہ چھوڑتا۔ لیکن وہ ان کو مہلت دیتا ہے ایک متعینہ مدت تک۔ پس جب ان کی مدت پوری ہو جائے گی تو بیشک اللہ اپنے بندوں کا نگران حال ہے۔

یہاں اس سے کسی قدر مختلف پہلو اختیار فرمایا ہے۔ یہاں فرمایا ہے کہ وہ روز جزا یوم الفصل دو ٹوک فیصلہ کا دن ہوگا۔ پس رحمت الٰہی مقتضی ہوئی کہ لوگوں کو مہلت بخشے اور نصیحت و عبرت کے زیادہ سے زیادہ مواعظ ان کے کانوں تک پہنچا دے تاکہ جو غافل اور بے پروا ہیں ان پر حجت تمام ہو جائے اور جن کے دلوں میں نصیحتوں کے سننے اور قبول کرنے کی کچھ صلاحیت موجود ہے وہ اپنے لیے نجات کی راہ ڈھونڈھ لیں۔ کیونکہ جب وہ دو ٹوک فیصلہ کا دن آجائے گا، تو مہلتوں کے دروازے بند ہو جائیں گے۔ پھر نہ تو غافلوں کے لیے توبہ کی فرصت باقی رہے گی اور نہ ان کا کوئی عذر ہی مسموع ہوگا اور نہ ان کے پاس کوئی تدبیر ہی ایسی ہوگی جس سے وہ خدا کے انتقام کی سخت پکڑ اور اس کی عدالت کاملہ کے فیصلہ سے اپنے کو بچا سکیں — چنانچہ اس حقیقت کو پوری طرح واضح کرنے کے لیے پہلے اس یَوْمُ الْفَصْلِ کی عظمت و اہمیت بیان فرمائی۔ اس کے بعد ان لوگوں کی حمایت کو آشکارا کیا جو اس دن کی آمد کے منکر ہیں، کیونکہ وہ ایک ایسے دن کے منکر ہیں جو اٹل ہے، اگرچہ اس کے ظہور میں دیر ہو۔ اس کے بعد پندرھویں آیت وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ ہے۔ غور کرو کہ یَوْمُ الْفَصْلِ اور یَوْمُ الْجَزَاء کے ذکر کے بعد اس آیت کا آنا کس قدر برموقع اور بلیغ اسلوب کلام ہے۔ ان دو جامع لفظوں کے اندر وہ سب کچھ بیان ہو گیا جو اس دن منکروں کے سامنے آئے گا۔ اس کے بعد خرابی کے اسباب اور اس کے مختلف پہلوؤں کی تفصیل کر دی جو آگے دیکھو گے۔ اب ہر ترجیع کے بعد اسی جامع مفہوم میں سے کوئی مناسب مقام پہلو نمودار ہو جائے گا۔

یہاں تک فطرت کے عام احوال و معاملات سے استدلال تھا اس کے بعد کلام نے دوسری روش اختیار کر لی۔ یعنی گزرے ہوئے واقعات، ثابت و قائم آثار اور آزمائی ہوئی سنت اللہ سے شہادت پیش کی ہے، اور یہ قرآن مجید کا ایک معروف انداز ہے، فرمایا:

اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ نُتْبِعُهُمُ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۸﴾
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۱۹﴾ اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ﴿۲۰﴾ فَجَعَلْنٰهُ
فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ﴿۲۱﴾ اِلٰى قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۲﴾ فَقَدَرْنَا ۖ فَنِعْمَ الْقٰدِرُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَيْلٌ
يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۴﴾ اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ كِفَاتًا ﴿۲۵﴾ اَحْيَآءً وَّاَمْوَاتًا ﴿۲۶﴾ وَّ
جَعَلْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ وَّاَسْقَيْنٰكُمْ مَّآءً فُرَاتًا ﴿۲۷﴾ وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۸﴾

کیا ہم نے مٹا نہ دیا اگلوں کو، پھر ان کے پیچھے لگایا پچھلوں کو بھی، گنہگاروں کے ساتھ ہم یونہی کیا کرتے ہیں۔ اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ کیا ہم نے تمھیں ایک بے حقیقت پانی سے نہیں بنایا، پھر اسے ایک آرام کی جگہ میں رکھا۔ ایک مقرر زمانہ تک، ہم نے مقرر کیا، کیا خوب ہم مقرر کرتے ہیں۔ اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ کیا ہم نے زمین کو سمیٹنے والی نہیں بنایا؟ زندہ اور مردہ کو۔ اور اس میں گڑے ہوئے اونچے پہاڑ بنائے اور تم کو خوشگوار پانی پلایا۔ اس دن منکروں کی خرابی ہے۔

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

مَّهِيْنٍ 'مھنہ' کے معنی ہیں عدم اہتمام کے۔ یہیں سے اس میں ابتذال اور تحقیر کا مفہوم پیدا ہوگیا۔ امھنت الشی کے معنی ہوئے۔ تم نے اس کو حقیر اور مبتذل خیال کیا۔ اسی سے ماھن ہے جس کے معنی نوکر اور غلام کے ہیں۔ مھنۃ کے معنی خدمت کے ہیں۔ مَهْنَة (اس کی خدمت کی) قرآن مجید میں ہے۔ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ (ہر لپاٹیے ذلیل کی بات نہ سنو) مَهِيْن یعنی مبتذل ایک جگہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرعون کا قول نقل ہوا ہے۔ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ (یا میں بہتر ہوں اس سے جو ایک حقیر آدمی ہے اور اپنی بات کھول کر کہہ بھی نہیں سکتا)

قَرَارٍ قرار کے معنی سکون اور جائے سکون دونوں کے آتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس کو دونوں معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے۔ وَاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ (آخرت ہی سکون کا گھر ہے) دوسری جگہ فرمایا ہے اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا۔ یہاں قرار کا لفظ موقع قرار کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے۔ يَصْلَوْنَهَا ۖ وَبِئْسَ الْقَرَارُ (اس میں داخل ہوں گے اور وہ برا ٹھکانا ہے) یہیں سے قرار کا لفظ زمین کے ایک ہموار و مطمئن گوشہ کے لیے بھی استعمال ہوا۔ مثلاً فرمایا وَاٰوَيْنٰهُمَآ اِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَّمَعِيْنٍ (اور ہم نے ان کو ایک پر سکون اور چشمہ والے ٹیلہ کی طرف پناہ دی)

مَّكِيْنٍ مکین کے معنی ہیں، مطمئن کے۔ کبھی یہ جگہ کی صفت کے لیے آتا ہے؛ اس وقت اس سے مراد ایسی جگہ ہوتی ہے جو ہر طرح کے اضطراب و تزلزل سے بالکل محفوظ ہو۔ اور کبھی یہ ذوی العقول کی تعریف کے لیے آتا ہے، اس وقت اس سے ایسا شخص مراد ہوتا ہے جو بھروسہ اور اعتماد کے لائق اور مرتبہ کے لحاظ سے صاحب عزت و رسوخ ہو۔ قرآن مجید میں ہے عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ۔ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ (وہ عرش والے کے نزدیک باوقار ہے، اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ پھر وہ امین ہے) بادشاہ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا تھا۔ اِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِيْنٌ اَمِيْنٌ (اب آپ ہمارے نزدیک قابل عزت اور قابل اعتماد ہیں)

قَدَرٍ قدر الشی چیز کی مقدار اور اس کا اندازہ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ (ہم نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے ایک اندازہ کے ساتھ) دوسری جگہ ہے وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ (نہیں ہے کوئی چیز مگر ہمارے پاس اس کے خزانے موجود ہیں اور ہم اس کو نہیں اتارتے مگر ایک متعین اندازہ کے ساتھ) سکون دال کے ساتھ بھی اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا دوسری جگہ ہے وَكَانَ اَمْرُ اللّٰهِ قَدَرًا مَّقْدُوْرًا۔

مَّعْلُوْمٍ معلوم کے معنی ہیں معین کے، ٹھہرا ہوا اور گزر چکے ہیں۔ جو چیز معین نہیں ہے مبہم ہوگی، اسے معلوم نہیں کہہ سکتے۔

فَقَدَرْنَا یہ قدر سے ہے، بمعنی تقدیر کے، یعنی اندازہ ٹھہرانا، ٹھہرا ہوا اوپر گزر چکے ہیں۔ اور قدرت سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور یہ معنی بھی نہایت معروف ہیں۔ یہاں دونوں معنی لگ سکتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں اس کی ان دونوں صفتوں کی جلوہ گری ہے...... قرآن مجید میں ان دونوں کے نظائر بھی موجود ہیں۔

كِفَاتًا کفتہ، ضمہ وجمعہ، جمع کرلیا۔ اکٹھا کرلیا۔ حدیث شریف میں ہے اکفتوا صبیانکم باللیل (رات میں اپنے بچوں کو اکٹھا کرلیا کرو)۔ کفتہ عن وجہہ کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے چہرہ سے ہٹا دیا۔ اسی سے کفت چھوٹی ہانڈی کے معنی میں ہے۔ عربی میں فعال کا وزن اس چیز کے لیے بھی آتا ہے جس کے ذریعہ سے فعل انجام پذیر ہو۔ مثلاً زمام اسی معنی کے اعتبار سے اس میں فاعل کی قوت پیدا ہوگئی ہے اور اس کے بعد مفعول کا استعمال جائز ہوا۔

رَوَاسِيَ شٰمِخٰتٍ یعنی پہاڑ جن کی جڑیں زمین میں گڑی ہوئی اور چوٹیاں فضا میں بلند ہیں۔ صفت نے موصوف کو خود واضح کردیا۔ اس وجہ سے موصوف کا ذکر نہیں ہوا۔ عربی میں یہ اسلوب بہت عام ہے اور قرآن مجید میں اس کی بہت مثالیں مل سکتی ہیں۔

فُرَاتًا وہ پانی جو نہایت شیریں ہو۔ قرآن مجید میں ہے وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ (اور وہی ہے جس نے دو دریا چھوڑے ہیں، ایک نہایت شیریں دوسرا کھاری) دوسری جگہ ہے وَمَا يَسْتَوِي الْبَحْرٰنِ ۖ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ سَآئِغٌ شَرَابُهٗ وَهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ (اور دونوں دریا یکساں نہیں ہیں، ایک نہایت شیریں ہے جس کا پینا خوشگوار ہے اور دوسرا کھاری تلخ) اسی وجہ سے کوفہ کی نہر کو فرات کہتے ہیں۔

۶- ان آیات کی تفسیر، ان کا نظم اور معاد پر ان کی حجت

ان آیات میں تین فقرے اور تین ترجیعات ہیں۔ اور یہ تینوں ترجیعات تین مستقل خطابات کے بعد بار بار نمودار ہوئی ہیں۔ ہر خطاب استفہام اقراری سے شروع ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ تمام باتیں مخاطب کی جانی بوجھی ہوئی ہیں۔

پھر غور کرو یہ تینوں خطابات تین مختلف پہلوؤں سے معاد پر دلیل پیش کرتے ہیں۔ پہلے خطاب میں، زمین کے آثار و نشانات سے استدلال ہے، دوسرے فقرے میں انسان کی خلقت اور رحم کے اندر اس کی پرورش اور صورت گری سے استشہاد ہے اور تیسرے میں اس زمین کو رحم کی مثال قرار دیا گیا ہے اور اس پہلو سے معاد پر اس سے دلیل پیش کی گئی ہے۔

یہ پہلا خطاب، ان واقعات کو یاد دلاتا ہے جن کے آثار مخاطب کے گرد و پیش موجود ہیں۔ یعنی نافرمان قوموں کی ہلاکت و بربادی کے واقعات۔ اہل عرب خوب واقف تھے کہ اللہ تعالےٰ نے بعض قوموں مثلاً قوم عاد اور قوم لوط کو ہوا کا عذاب بھیج کر ہلاک کر دیا۔ یہاں چونکہ ہوا کے تصرفات کی شہادت موجود تھی اور مقصود آس پاس کی معذب بستیوں سے عبرت دلانا تھا اس وجہ سے معاملہ بغیر کسی تفصیل کے خود واضح تھا۔ چنانچہ واقعات کا ذکر نہیں فرمایا صرف اجمال کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کر دیا۔ اَلَمْ نُهْلِكِ الْاَوَّلِيْنَ ...... كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ لیکن دوسرے مقامات میں نہایت تفصیل کے ساتھ اس کو بیان کیا ہے۔

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ .... وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ۔ (الاحقاف ۲۴-۲۵-۲۷)

پس جب انھوں نے اس کو دیکھا ابر کی شکل میں بڑھتا ہوا اپنی وادیوں کی طرف، کہا یہ تو ابر ہے جو ہم پر برس کے رہے گا۔ نہیں بلکہ یہ، وہ چیز ہے جس کے لیے تم جلدی مچا رہے تھے، تند ہوا جس میں دردناک عذاب ہے، اپنے رب کے حکم سے ہر چیز کو تہس نہس کر دے گی پس وہ اس طرح ہلاک ہو گئے کہ ان کے گھروں کے سوا کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں ہم گنہگاروں کو..... اور ہم نے تمہارے آس پاس کی بستیاں ہلاک کر دیں اور اپنی آیتیں پھیر پھیر کر بیان کیں کہ وہ رجوع کریں۔

اب اس روشنی میں، اگر اس خطاب کو سمجھا جائے تو اس کے معنی بالکل واضح ہو جائیں گے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم نے اگلے مجرموں اور شریروں کو ہلاک کر دیا۔ اور یہ ہماری ایک جاری و قائم سنت ہے۔ یکے بعد دیگرے قوموں کی بربادی کے واقعات تم جانتے اور سنتے رہے ہو۔ پس آخرت کا معاملہ بھی یونہی ہے۔ جو گنہگار ہوں گے سزا پائیں گے جو نیکوکار ہوں گے وہ ہماری خوشنودی سے سرفراز ہوں گے۔ یہ تفصیل ایک يَوْمُ الْفَصْلِ کے واقع ہونے پر خود دلیل تھی۔ اس وجہ سے اس کے ذکر کی ضرورت نہ ہوئی، البتہ اس سے جو لازمی نتیجہ پیدا ہو رہا تھا اس کا ذکر کر دیا وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ

لِّلْمُكَذِّبِيْنَ (اس دن منکروں کی خرابی ہے) تاکہ منکرین کو اس دن جن حالات سے دوچار ہونا ہے وہ اس سے خبردار ہو جائیں گے۔ یہاں ویل کے ایک لفظ نے عذاب کی تمام اقسام کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ نیز آیت کے موقع سے یہ بات خود بخود نمایاں ہے کہ فیصلہ کے دن کا انکار ایک سخت ترین جرم ہے۔ یہ درحقیقت اللہ تعالےٰ کے عدل اور اس کی قدرت و رحمت کا انکار ہے۔ پھر یہ ہر طرح کے شرک و معصیت، کا سرچشمہ اور اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے سے متکبرانہ اعراض ہے۔ یہاں یہ باتیں اشارات سے معلوم ہو رہی ہیں۔ دوسرے مقامات میں ان کی پوری تفصیل آگئی ہے۔

دوسرے خطاب نے نظم کے ایک خوب صورت پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ یعنی پہلے میں آفاق کی شہادت پیش کی گئی تھی اور اس دوسرے میں انفس کی شہادت پیش کی گئی ہے۔ اور ان دونوں کا اجتماع قرآن مجید کی بعض آیات میں بالکل نمایاں ہے۔ مثلاً

وَفِي الْاَرْضِ اٰيٰتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ (الذاریات ۲۰-۲۱)

اور زمین میں نشانیاں ہیں یقین کرنے والوں کے لیے اور تمھارے نفوس کے اندر بھی۔ پس کیا تم کو نظر نہیں آتیں۔

اس خطاب میں جن امور کا ذکر کیا ہے ان سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جس پروردگار نے تمھاری خلقت کی چھوٹی چھوٹی جزئیات کا اہتمام فرمایا ہے، کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ تمھاری زندگی کے کلی امور سے جو بالکل بنیادی اور نہایت اہم ہیں، بے پروا ہو جائے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ جب وہ پہلی بار تمھاری خلقت اور مصوری پر قادر ہوا اور کوئی چیز اس کو عاجز نہ کر سکی تو تم کو دوبارہ اٹھا کھڑا کرنا تو اس کے لیے اور آسان ہے۔

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا۔ (مریم ۶۶-۶۷)

اور انسان کہتا ہے کہ کیا جب میں مر جاؤں گا، زندہ کر کے نکالا جاؤں گا! کیا انسان کو یاد نہیں کہ ہم نے اس کو پہلے پیدا کیا حالانکہ وہ کچھ نہ تھا۔

ان دونوں پہلوؤں سے یہ ٹکڑا ایک روز فیصلہ کے وقوع کو خود بخود واضح کر رہا تھا اس وجہ سے اس کے ذکر کی ضرورت نہیں ہوئی بلکہ فرمایا وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ جس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی اس تقدیر اور اس کی اس قدرت کے منکر ہوں گے ان کے لیے خرابی ہے، جب وہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے اور دیکھیں گے کہ وہ چیز سامنے کھڑی ہے۔ جس کا وہ دنیا میں انکار کر رہے تھے تو ان کی تباہی ان پر پوری طرح آشکارا ہو جائے گی۔

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ۔ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ۔ (الصّٰفّٰت ۱۹-۲۱)

وہ تو بس ایک ہی ڈانٹ ہو گی کہ دفعتہً وہ تکنے لگیں گے۔ اور کہیں گے ہائے ہماری بدبختی! یہ تو جزا کا دن ہے۔ یہ فیصلہ کا وہی دن ہے جس کا تم انکار کرتے تھے۔

تیسرے خطاب پر غور کرنے سے جمع مثل بامثل کی ایک عمدہ مثال ہمارے سامنے آتی ہے یعنی جس طرح زمین کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ معاد کی دلیلوں اور نشانیوں سے معمور ہے جیسا کہ اوپر ہم نے عاد وغیرہ کے قصہ کا حوالہ دیا ہے، اور قرآن مجید

نے بار بار اس کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، اسی طرح زمین کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ وہ رحم سے بہت مشابہ ہے، بلکہ دونوں کی مشترک خصوصیات پر غور کرنے کے بعد بے تکلف کہا جا سکتا ہے کہ جمیع خصوصیات کے اعتبار سے زمین کا پہلو نمایاں طور پر مرجح ہے۔ اور قرآن مجید نے زمین کی صفت میں کِفَاتًا اَحْیَآءً وَّاَمْوَاتًا (سمیٹنے والی زندہ اور مردہ کو) کہہ کر درحقیقت اس کی اسی ترجیح کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں پہاڑ گاڑ کر اس کو آرام و سکون کی جگہ بنایا۔

وَاَلْقٰی فِی الْاَرْضِ رَوَاسِیَ اَنْ تَمِیْدَ بِکُمْ۔

اور بنائے زمین میں گڑے ہوئے پہاڑ کہ تمھیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔

پھر ان پہاڑوں کو اونچا بنایا اور ان کے ذریعہ سے بادلوں کو روک کر زمین میں بقدر ضرورت پانی کا خزانہ جمع کر دیا۔ پھر اس سے سوتیں اور نہریں جاری کیں۔ ان تمام امور کی طرف قرآن نے جابجا اشارات کیے ہیں۔

غرض پہاڑوں کے ذریعہ سے زمین کو پا برجا اور مطمئن کر کے اور ان کی چوٹیوں، گھاٹیوں اور چشموں سے شیریں پانی کی سوتیں جاری کر کے، اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے اس کو ویسا ہی پرامن گہوارہ بنا دیا ہے جیسا کہ رحم۔ جس میں جسم کے تمام گوشوں سے اس کے لیے غذا کا ذخیرہ نچڑ نچڑ کر جمع ہوتا ہے اور جس کی تعریف میں فرمایا ہے۔ فَجَعَلْنٰهُ فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ۔

بلکہ غور کرو تو معلوم ہوگا کہ ان تمام خصوصیات میں زمین کا پہلو رحم کے مقابل میں نمایاں طور پر مرجح ہے یہ تمام باتیں جس جامعیت و کمال کے ساتھ زمین میں پائی جاتی ہیں، اس جامعیت و کمال کے ساتھ رحم میں نہیں پائی جاتیں۔ زمین تمام مخلوقات کے لیے بمنزلہ رحم ہے۔ پھر جب انسان مرتا ہے اور اس میں دفن کیا جاتا ہے تو گویا وہ اسی ماں کے رحم میں رکھ دیا جاتا ہے جس نے اسے جنا تھا۔ قرآن مجید کی یہ آیت اس حقیقت کی طرف کس قدر لطیف اشارہ کر رہی ہے۔

مِنْهَا خَلَقْنٰکُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُکُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُکُمْ تَارَةً اُخْرٰی۔ (طٰہٰ۔ ۵۵)

اسی سے ہم نے تم کو پیدا کیا اور اسی میں تم کو لوٹائیں گے اور پھر اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے۔

ظاہر ہے دوبارہ پیدا کرنا پہلی مرتبہ پیدا کرنے سے زیادہ عجیب نہیں ہے، پھر انسان اس کی کیوں تکذیب کرے۔ اگر وہ زمین کے معاملات اور اس کے اندر اپنی زندگی اور موت کی اصل نوعیت پر غور کرے تو وہ ہرگز دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس پر ایک نئی حقیقت روشن ہوگی جو اس کے ایمان و یقین کو اور زیادہ مضبوط کر دے گی۔ وہ دیکھے گا کہ جس دن وہ پیدا ہوا تو گویا پیدا نہیں ہوا بلکہ اس کا حمل قرار پایا اور جس دن مرا تو گویا مرا نہیں بلکہ پیدا ہوا۔

پھر دوسرے پہلو سے غور کرے گا تو ایک اور حقیقت اس کے سامنے آئے گی۔ وہ دیکھے گا کہ جس دن وہ مرا تو گویا مرا نہیں، بلکہ زمین کے پیٹ میں اس کا حمل قرار پایا۔ اب ناگزیر ہے کہ اس حمل کے لیے بھی ایک دن وضع حمل کا آئے اور وہ دن وہی ہوگا جس کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا۔

جب زمین میں بھونچال ڈالا جائے اور زمین اپنے بوجھ باہر ڈال دے۔

اس تفصیل پر غور کرنے کے بعد، یہ حقیقت آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ اس کلام کا مقصد ربوبیت اور احاطہ کے پہلو سے معاد پر استدلال ہے۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ ہمارا پروردگار ہے اور ہم زندگی اور موت دونوں حالتوں میں اسی کی مٹھی میں ہیں تو ناگزیر ہے کہ ایک دن باز پرس کا بھی آئے جس میں ہم اپنے اعمال کے متعلق جواب دہ ہوں۔

اس طرح کلام درجہ بدرجہ ایک روز فیصلہ کے ثبوت تک خود بخود پہنچ گیا۔ اور اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہی کہ لفظوں میں اس کو بیان کیا جائے۔ چنانچہ اس کے ذکر سے آگے بڑھ کر فرمایا وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ (اس دن خرابی ہے انکار کرنے والوں کے لیے) یعنی جن لوگوں نے آج خدا کی پروردگاری اور اس کی قدرت کا انکار کیا ہے، جب وہ اپنے پروردگار کے حضور جمع کیے جائیں گے تو ان کے سامنے ان کے اس انکار کی شامت پوری طرح آشکارا ہو جائے گی۔ اسی حقیقت کی طرف یوں اشارہ فرمایا ہے:

وَنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰی رَبِّهِمْ یَنْسِلُوْنَ۔ قَالُوْا یٰوَیْلَنَا مَنْۢ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ۔ (یٰسٓ۔ ۵۱-۵۲)

اور صور پھونکا جائے گا تو دفعتہً وہ قبروں سے نکل کر اپنے پروردگار کی طرف چل کھڑے ہوں گے اور کہیں گے ہائے ہماری بدبختی! ہم کو کس نے ہماری خوابگاہ سے اٹھایا؟ یہی وہ چیز ہے جس کا خدائے رحمٰن نے وعدہ کیا تھا اور پیغمبروں نے سچ کہا تھا۔

اس کے بعد بلاغت کا ایک نیا اسلوب نمودار ہوا ہے۔ یعنی جو چیز اب تک نگاہوں سے اوجھل تھی وہ سامنے حاضر کر دی گئی ہے۔ چنانچہ کلام کا اسلوب ایسا اختیار کر لیا گیا ہے جو ایک حاضر و مشہود چیز کے مناسب حال ہوتا ہے۔ گویا وہ فیصلہ کا دن آچکا ہے، لوگ اپنے پروردگار کے حضور کھڑے ہیں، اور جس چیز کا اب تک انکار کرتے رہے تھے وہ سامنے موجود ہے۔ فرمایا:

اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰی مَا کُنْتُمْ بِهٖ تُکَذِّبُوْنَ ﴿۲۹﴾ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰی ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ ﴿۳۰﴾ لَّا ظَلِیْلٍ وَّلَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّهَبِ ﴿۳۱﴾ اِنَّهَا تَرْمِیْ بِشَرَرٍ کَالْقَصْرِ ﴿۳۲﴾ کَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ﴿۳۳﴾ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ ﴿۳۴﴾ هٰذَا یَوْمُ لَا یَنْطِقُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَلَا یُؤْذَنُ لَهُمْ فَیَعْتَذِرُوْنَ ﴿۳۶﴾ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ ﴿۳۷﴾ هٰذَا یَوْمُ الْفَصْلِ جَمَعْنٰکُمْ وَالْاَوَّلِیْنَ ﴿۳۸﴾ فَاِنْ کَانَ لَکُمْ کَیْدٌ فَکِیْدُوْنِ ﴿۳۹﴾ وَیْلٌ یَّوْمَئِذٍ لِّلْمُکَذِّبِیْنَ ﴿۴۰﴾

جس کے تم منکر تھے اس کی طرف چلو۔ تین طرف پھوٹنے والے سایہ میں چلو، جس میں نہ چھاؤں ہے نہ لپٹ سے بچاؤ، گنبدوں کے برابر اس میں چنگاریاں اڑتی ہیں، زرد اونٹوں کی مانند۔ اس دن منکروں

کی خرابی ہے، یہ وہ دن ہوگا کہ ان سے بات نہ نکلے گی اور نہ اجازت ہوگی کہ معذرت کریں۔ اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ یہ فیصلہ کا دن ہے ہم نے تمھیں اور اگلوں کو جمع کیا۔ پھر اگر تمھارے پاس کوئی چال ہے تو ہم سے چلو۔ ان دن منکروں کی خرابی ہے۔

۷۔ الفاظ کی تحقیق اور جملوں کی تاویل

(۲۹-۴۰)

ظِلٍّ ذِی ثَلٰثِ شُعَبٍ سے مراد دھوئیں کا سایہ ہے۔ آگ کے کسی بڑے الاؤ سے جب دھواں اٹھتا ہے تو اس سے مختلف، شاخیں پھوٹ نکلتی ہیں اور وہ بالکل سائبان کی طرح چھا لیتا ہے۔ اس کی تاویل آگے بیان ہوگی۔

لَا ظَلِیْلٍ الآیۃ یعنی سایہ کی ٹھنڈک سے بالکل خالی ہوگا۔ وَلَا یُغْنِیْ مِنَ اللَّھَبِ کہہ کر اس کی مزید توضیح کر دی ہے۔ ایک جگہ فرمایا ہے وَظِلٍّ مِّنْ یَّحْمُوْمٍ لَّا بَارِدٍ وَّلَا کَرِیْمٍ اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ اوپر لفظ (سایہ) سے جو وہم پیدا ہو رہا تھا اس نفی نے اس کا ازالہ کر دیا۔

اِنَّہَا یعنی وہ شعلے جو اس سایہ کے پیچھے ہیں۔

کَالْقَصْرِ مشہور قرأت سکون صاد کے ساتھ ہے۔ اس وجہ سے وہ قول ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے جو حضرت ابن عباس کی طرف منسوب ہے کہ اس سے اونٹوں کی گردنیں مراد ہیں اور یہ قصرۃ کی جمع بمعنی اصل العنق ہے۔ اولاً تو لبعد کا قافیہ (فاصلہ) اس سے ہم آہنگ نہیں ہوتا۔ ثانیاً قصرۃ گردن کی جڑ کو کہتے ہیں یعنی یہ انسانی جسم میں ایک مخصوص جگہ کا نام ہے۔ کسی مستقل عضو کا نام نہیں ہے کہ اس سے شعلوں کو تشبیہ دی جائے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ قصرۃ کی جمع ہے۔ قصرۃ بڑے درخت کی جڑ کو کہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ قول بھی صحیح نہیں ہے۔ لبعد کی تشبیہ اس سے مطابق نہیں ہوتی۔ پھر یہ دونوں لفظ قرآن کی زبان سے نامانوس ہیں اور کوئی قرینہ ایسا موجود نہیں جو ان کی توضیح کر دے۔ رہا لفظ قصر تو وہ قرآن میں بار بار ایسا آیا ہے۔ پس ظاہر تاویل ہی ہمارے نزدیک قابل قبول ہے اور یہی ابن مسعودؓ سے مروی ہے۔

یہ تشبیہ شعلوں کے پھیلاؤ، ان کی بلندی اور رنگ میں ہے کیونکہ محل عموماً بلند جگہ پر تعمیر کیے جاتے ہیں اور دور سے دیکھو تو ان کا رنگ چمکتا نظر آئے گا اور اوپر کا رنگ نیچے کے رنگ سے مختلف معلوم ہوگا۔ یہاں تشبیہ میں محلوں کی بڑائی کا پہلو مدنظر نہیں ہے بلکہ صرف ان کی وہ ہیئت پیش نظر ہے جو دور سے نظر آتی ہے۔ اہل عرب نے اس لفظ کو مشبّہ اور مشبّہ بہ دونوں صورتوں میں استعمال کیا ہے اور پیش نظر وہی پہلو ہے جو ہم نے بیان کیا ہے۔

واعرضت الیمامہ واشمخرت کاسیاف بایدی مصلتینا

اور یمامہ کی بستیاں سامنے سے ایسی ابھری نظر آتی ہیں جیسے تلواریں سونتنے والوں کے ہاتھوں میں تلواریں۔

اسی وجہ سے اونٹنی کو محل اور پل سے اکثر تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ عربی زبان میں اس قدر عام بات ہے کہ اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے لبعد جمالۃ صفر سے جو تشبیہ دی ہے اس سے اس دعویٰ پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

کَاَنَّہٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ ضمیر کا مرجع شرر ہے اور یہاں رعایت لفظ کی کی گئی ہے۔ شرر اسم منف ہے۔ اس وجہ سے مذکر، مونث، واحد، جمع سب کے لیے اس کا استعمال یکساں ہوتا ہے۔ یہاں جمع کے مفہوم میں ہے اور جمالۃ صفر سے تشبیہ اس کا ثبوت ہے۔ جمالۃ اونٹوں کی جماعت کو کہتے ہیں۔ یہ تشبیہ شعلوں اور چنگاریوں کے رنگ اور ان کی بڑائی دونوں کو ایک ہی ساتھ نمایاں کر رہی ہے۔ صفرۃ (زردی) کی اس لیے قید لگائی ہے کہ دھوئیں کی آڑ سے شعلوں کا منظر ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔

۸۔ ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ سے ایک لطیف نکتہ

ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ (تین طرف پھوٹنے والا سایہ) جہنم کو اس طرح مصور کر کے پیش کر رہا ہے گویا وہ کسی جاندار چیز کی طرح لپکی ہوئی چلی آ رہی ہے اور اس کا دھواں تین مختلف سمتوں میں پھیلا ہوا ہے۔ قرآن مجید میں دوسرے مقامات میں بھی جہنم کی تصویر کچھ اسی سے ملتی جلتی پیش کی گئی ہے۔

وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ کَذَّبَ بِالسَّاعَۃِ سَعِیْرًا ۝ اِذَا رَاَتْھُمْ مِّنْ مَّکَانٍۢ بَعِیْدٍ سَمِعُوْا لَھَا تَغَیُّظًا وَّزَفِیْرًا (الفرقان - ۱۱-۱۲)

اور جنھوں نے قیامت کا انکار کیا ہم نے ان کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے۔ جب ان کو دور ہی سے دیکھے گی وہ اس کا زور شور سنیں گے۔

اس سے زیادہ واضح تصویر سورۂ ق میں ہے:

یَوْمَ نَقُوْلُ لِجَھَنَّمَ ھَلِ امْتَلَاْتِ وَتَقُوْلُ ھَلْ مِنْ مَّزِیْدٍ۔ (۳۰)

جس دن ہم پوچھیں گے جہنم سے کیا تو بھر گئی اور وہ کہے گی کہ کیا اور ہے؟

دوسری جگہ فرمایا ہے:

اِنَّھَا لَظٰی ۝ نَزَّاعَۃً لِّلشَّوٰی ۝ تَدْعُوْا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰی (المعارج - ۱۵-۱۷)

بیشک وہ لپٹ ہے ادھیڑ دے گی پنڈلی کا گوشت اور جنھوں نے اعراض کیا اور سرگردانی کی ان کو کھینچ بلائے گی۔

یہاں ثَلٰثِ شُعَبٍ سے بظاہر مقصد تو صرف، آگ کے ہیجان و اشتعال کو بتلانا ہے لیکن اگر اس پر غور کیجیے تو فکر و نظر کے لیے بھی اس میں کافی وسعت ہے۔

یہ معلوم ہے کہ کفر کی بنیادی خصلتیں تین ہیں (۱) اللہ تعالیٰ سے غفلت (۲) مخلوق سے بے پروائی (۳) روز جزا کا انکار۔ ان امور کی تفصیل اپنے موقع پر گزر چکی ہے۔ یہاں زیادہ تفصیل کے ساتھ اس پر بحث کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم بعض دلائل

کا حوالہ فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

ایک جگہ اہل جنت اور اہل جہنم کا ایک مکالمہ ان لفظوں میں مذکور ہوا ہے۔

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ، قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ۔ (مدثر - ۴۲-۴۶)

کون چیز تم کو دوزخ میں لائی۔ کہیں گے ہم نہ نماز پڑھا کرتے تھے اور نہ مسکین کو کھانا کھلاتے تھے، جو لوگ بے ہودہ بکواس کیا کرتے تھے ان کے ساتھ ہم بھی بکواس کیا کرتے تھے اور جزا کے دن کا انکار کرتے تھے۔

اس آیت میں خوض سے مراد انکار قرآن ہے اور اس انکار کی اصلی وجہ یہ تھی کہ قرآن روز جزا کی خبر دیتا ہے جس کو تسلیم کرنے کے لیے وہ ہرگز آمادہ نہ تھے۔ دوسری جگہ فرمایا:

فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَى فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْيُسْرَى وَأَمَّا مَنْ بَخِلَ وَاسْتَغْنَى وَكَذَّبَ بِالْحُسْنَى فَسَنُيَسِّرُهُ لِلْعُسْرَى۔ (اللیل)

سو جس نے سخاوت کی اور ڈر کر چلا اور اچھی بات کو سچ مانا اس کو ہم سہج کردیں گے آرام دینے والی اور جس نے بخالت اور بے پروائی کی اور اچھی بات کو جھٹلایا اس پر سہج کردیں گے مشکل میں ڈالنے والی۔

ان دونوں آیتوں کے مطالب پر پوری وسعت کے ساتھ غور کرو، ان سے کفار کی یہ تینوں بنیادی خصلتیں پوری طرح نمایاں ہو جائیں گی۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ انہی تین خصلتوں کے مطابق جہنم سے عذاب کی تین شاخیں نمودار ہو کر ان کی طرف بڑھیں گی اور ان کو چھا لیں گی۔ وَاللّٰہُ تَعَالٰی اَعْلَمُ۔

اسی سے ملتی ہوئی تاویل حضرت ابن عمرؓ سے منقول ہے۔

ابو عبداللہ جدلی راوی ہیں کہ میں بیت المقدس میں آیا، دیکھا کہ عبادہ بن صامتؓ، عبداللہ بن عمروؓ اور کعب احبارؒ بیت المقدس میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ عبادہ نے کہا، جب قیامت کا دن آئے گا، اللہ تعالیٰ لوگوں کو ایک میدان میں جمع کرے گا یہاں تک کہ ایک ہی جگہ سے ان کو نگاہ دیکھ سکے گی اور داعی اپنی آواز سنا سکے گا اور اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا، آج کے دن ان کے منہ سے بات نہ نکلے گی۔ یہ فیصلہ کا دن ہے۔ ہم نے تم کو اور تمہارے اگلوں کو جمع کر لیا ہے۔ پس اگر آج تمہارے پاس کوئی داؤ ہو تو وہ ہمارے ساتھ کر دیکھو، آج کوئی متمرد اور سرکش شیطان مجھ سے نجات نہ پا سکے گا، اس کے بعد عبداللہ بن عمر نے کہا کہ کتاب میں ہم پاتے ہیں کہ قیامت کے دن جہنم سے ایک گردن نمودار ہوگی اور جب وہ لوگوں کے سامنے آئے گی تو کہے گی اے لوگو! میں تین قسم کے لوگوں کے پاس بھیجی گئی ہوں جن کو میں اس سے زیادہ پہچانتی ہوں جتنا باپ اپنے بیٹے کو، اور بھائی اپنے بھائی کو پہچانتا ہے۔ آج ان کو نہ کوئی چیز بچا سکتی ہے اور نہ کوئی چیز چھپا سکتی ہے۔ خدا کا شریک ٹھہرانے والے اور جبار و سرکش اور متمرد شیطان۔ فرمایا، پھر ان کو لپیٹ لے گی اور جہنم میں حساب سے چالیس سال پہلے ڈال دے گی (اخرجہ ابن حاتم)

مجھے خیال ہوتا ہے کہ یہاں عبداللہ بن عمرؓ نے جن تین جماعتوں کا ذکر فرمایا ہے وہ آیت ذیل سے اخذ کرکے فرمایا ہے:

أَلْقِيَا فِي جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيدٍ مَنَّاعٍ لِلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُرِيبٍ الَّذِي جَعَلَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ فَأَلْقِيَاهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيدِ۔ (قٓ - ۲۴-۲۶)

ڈال دو جہنم میں ہر ناشکرے سرکش، بھلائی سے روکنے والے، حد سے بڑھنے والے، شک میں پڑنے والے کو جس نے اللہ کے ساتھ دوسرا معبود ٹھہرایا، پس اس کو ڈال دو سخت عذاب میں۔

اور اگر ان پر تامل کرو تو وہی تین صفتیں تمہارے سامنے آئیں گی جو اوپر ہم نے بیان کی ہیں۔ یعنی خلق خدا سے بے پروائی آخرت کا انکار، خدا سے غفلت، کیونکہ شرک خدا سے غفلت ہی کا نتیجہ ہے۔

۹۔ ان آیات کے نظم اور مواقع ترجیح پر ایک مجموعی نظر

اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ یہاں خطاب کا اسلوب ایسا اختیار فرمایا ہے جس سے پردہ کی چیز بالکل ننگا ہوں کے سامنے آگئی ہے اور ظاہر ہے کہ اثر انگیزی کے اعتبار سے یہ اسلوب نہایت اعلیٰ ہے اور چونکہ یہ اثر کمال درجہ پر پیدا کرنا مقصود تھا اس وجہ سے قیامت کی تصویر ایسی کھینچی جو مخاطب کے حواس پر پوری طرح چھا جائے۔ پھر اسی مناسبت سے ویل کا ذکر فرمایا اور یہاں آیت ویل کے موقع و محل نے خود اس مفہوم کو پوری طرح واضح کر دیا جو یہاں پیش نظر ہے، یعنی یہ عذاب جو اپنی تمام ہولناکیوں کے ساتھ ان کے لیے بالکل تیار ہے، ان کے لیے نہایت خوفناک خرابیوں کا سبب ہوگا۔

شدت عذاب کے محسوس پہلو کی تصویر کھینچنے کے بعد اس کے اس پہلو کو بے نقاب کیا ہے جس کا احساس ذہن کرے گا۔ یعنی عذر و معذرت کی فرصت سے محرومی۔ اور یہ عذاب کی ظاہری ہولناکیوں کے بعد اس کا ایک باطنی تازیانہ ہوگا جو براہ راست دلوں پر لگے گا۔ چنانچہ اس کے بعد آیت ”ویل“ کو پھر دہرایا ہے اور موقع کے مخصوص حالات کے لحاظ سے اس کا مفہوم یہاں اس سے مختلف ہے جو اوپر بیان ہوا۔ یہاں یہ مفہوم ہے کہ اس دن ان کے لیے خرابی اور حسرت و نامرادی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ عذر و معذرت کے تمام دروازے بند ہو چکے ہوں گے۔

ان ترہیبات کے بعد ان کو پھر ایک نئے انداز سے خطاب فرمایا۔ اس خطاب میں جھڑکی اور تحقیر و تذلیل کا پہلو نمایاں ہے۔ دنیا میں معاد کا جو انکار کرتے رہے ہیں اس کا بانداز تحقیر جواب ہے۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا:

هَٰذِهِ النَّارُ الَّتِي كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُونَ أَفَسِحْرٌ هَٰذَا أَمْ أَنْتُمْ لَا تُبْصِرُونَ۔

یہی وہ جہنم ہے جس کا تم انکار کرتے تھے۔ یہ جادو ہے یا تمہیں سجھائی نہیں دیتا۔

اس خطاب میں اپنی قدرت کی بے پناہ وسعت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ ہم نے تمام اگلوں اور پچھلوں کو جمع کر لیا ہے۔ کوئی نہیں ہے جو آج کے دن ہماری پکڑ سے بچ رہا ہو۔ اس کے بعد پھر ایک خطاب نمودار ہوتا ہے، جو غائب کو مخاطب کے سامنے حاضر کر دیتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اس دن تمام تدبیریں اکارت

ہو جائیں گی۔ کوئی داؤ کام نہ آئے گا۔ اور جس طرح اوپر یہ بیان فرمایا تھا کہ اس دن عذر و معذرت کی تمام راہیں بند ہو جائیں گی اسی طرح یہاں بیان فرمایا کہ اس دن نہ کوئی چال اور تدبیر کام آئے گی نہ کوئی طاقت و قوت کچھ نفع پہنچائے گی۔ اس میں گویا ایک مخفی تعریض ہے کہ دنیا میں ان کو اپنی تدبیروں اور قوتوں پر بڑا غرہ رہا ہے، پھر آج ان سے کام کیوں نہیں لیتے؟ اس مضمون کے بعد آیت "ویل" پھر نمودار ہو گئی اور یہاں موقع کے لحاظ سے اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس دن ان کا کوئی داؤ کام نہ آئے گا، تمام تدبیریں دھری رہ جائیں گی صرف تباہی اور ذلت و رسوائی نصیب ہو گی۔

یہ چالیس آیتیں تمام ڈراوے کی ہیں۔ ان کے بعد جمع ترغیب و ترہیب کے اس عام اصول کے مطابق جس کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں، بشارت کی آیتیں آئیں تاکہ دوسرا پہلو بھی سامنے آجائے۔ پس فرمایا:

إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلَالٍ وَعُيُونٍ ﴿۴۱﴾ وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُونَ ﴿۴۲﴾ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿۴۳﴾ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ ﴿۴۴﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿۴۵﴾ كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُمْ مُجْرِمُونَ ﴿۴۶﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿۴۷﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ ﴿۴۸﴾ وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ ﴿۴۹﴾ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ﴿۵۰﴾

بے شک پرہیز گاروں کے لیے سائے ہوں گے اور چشمے اور جیسا جی چاہے میوے، مزے سے کھاؤ پیو اپنے اعمال کے بدلے۔ بھلائی کرنے والوں کو ہم یونہی دیا کرتے ہیں۔ اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ چند روز کھا لو اور مزے کر لو۔ تم تو ٹھہرے گنہگار۔ اس دن منکروں کی خرابی ہے اور جھکنے کو ان سے کہا جائے تو نہیں جھکتے۔ اس دن منکروں کی خرابی ہے۔ اب اس سے بڑھ کر کیا بات ہے جسے مانیں گے۔

۱۰۔ الفاظ کی تفسیر اور جملوں کی تاویل

فِي ظِلَالٍ یعنی سایوں کے درمیان۔ قرآن مجید میں یہ مضمون اور اسلوب بہت آیا ہے۔ مثلاً وَأَصْحَابُ الْيَمِينِ مَا أَصْحَابُ الْيَمِينِ فِي سِدْرٍ مَخْضُودٍ وَطَلْحٍ مَنْضُودٍ وَظِلٍّ مَمْدُودٍ وَمَاءٍ مَسْكُوبٍ وَفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ وَفُرُشٍ مَرْفُوعَةٍ (اور دہنے ہاتھ والے اور ان داہنے ہاتھ والوں کا

کیا کہنا۔ بے کانٹے کی بیریوں، لدے ہوئے کیلوں، لمبی لمبی چھاؤں، پانی کے جھرنوں، افراط کے میووں، جو بے روک ٹوک ان کو ملا کریں گے اور اونچے اونچے فرشوں کی آسائش میں مزے کر رہے ہوں گے) اور مقصود اس سے ان نعمتوں کا بیان ہے جن سے وہ گھرے ہوں گے، یہی اسلوب برج بن مسہر الطائی نے استعمال کیا ہے۔

فبتنا بين ذالك و بين مسك　　فيا عجبا العيش لو ان دوم

(پس ہم نے اس میں اور مشک کی خوشبوؤں میں شب بسر کی۔ کیا مزے کی زندگی تھی! کاش ہمیشہ رہتی)

هَنِيئًا فعل سابق سے جو مفعول مفہوم ہو رہا ہے اس سے حال پڑا ہوا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے۔ فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَرِيئًا جس میں ذو الحال واضح ہے۔ ذو الحال مقدر سے حال پڑنا عربی زبان کا ایک معروف اسلوب ہے۔ مثلاً مسافر کے لیے کہیں گے راشدا مهديا۔

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ اذا کا عام استقبال متقبل کے لیے ہے۔ قرآن مجید میں دوسری جگہ یہ بات وضاحت کے ساتھ بیان کردی گئی ہے کہ جب حشر میں سب لوگ اکٹھے کیے جا چکیں گے تو پروردگار کے حضور سجدے کے لیے بلائے جائیں گے جن لوگوں نے دنیا میں سجدہ نہ کیا ہو گا، وہ اس دن بھی سجدہ نہ کر سکیں گے۔

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ خَاشِعَةً أَبْصَارُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوا يُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ وَهُمْ سَالِمُونَ ۝ (القلم۔ ۴۲-۴۳)

جس دن کہ کھلبلی پڑے گی اور وہ بلائے جائیں گے سجدے کے لیے، پس سجدہ نہ کر سکیں گے اور ان کی نگاہیں جھکی ہوں گی، ذلت چھائی ہو گی اور وہ سجدے کے لیے بلائے جاتے تھے اور اس وقت بالکل صحیح و سالم تھے۔

پس آیت کی تاویل یہ ہو گی کہ وہ فیصلہ کے دن سجدہ نہ کر سکیں گے۔ حضرت ابن عباسؓ سے بھی اسی طرح کی روایت ہے۔

دوسری تاویل یہ ہو سکتی ہے کہ 'اذا' کو یہاں بیان عادت کے مفہوم میں لیا جائے اس مفہوم کے لحاظ سے تاویل یہ ہو گی کہ وہ دنیا میں نہیں جھکتے۔ اس کے بعد ہے "وَيْلٌ يَوْمَئِذٍ لِلْمُكَذِّبِينَ" جس کا مفہوم سیاق کے لحاظ سے یہ ہو گا کہ چونکہ وہ دنیا میں نہیں جھکے۔ اس وجہ سے وہ آخرت میں بھی نہ جھک سکیں گے اور یہ امر ان کے لیے باعث خرابی ہو گا۔

یہ محض الفاظ کا فرق ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے دونوں تاویلوں کا مقصد ایک ہی ہے۔

بَعْدَهُ یعنی اس بات کے بعد جو بہترین دلائل اور واضح ترین براہین کے ساتھ ان کو معاد اور خدا پرستی کی تلقین کر رہی ہے۔ دوسری جگہ فرمایا ہے فَبِأَيِّ حَدِيثٍ بَعْدَ اللَّهِ وَآيَاتِهِ يُؤْمِنُونَ (پس اللہ اور اس کی آیات سے بڑھ کر کیا بات ہے جس پر ایمان لائیں گے) پس بعدہ کا مفہوم وہی ہے جو فَبِأَيِّ حَدِيثٍ سے مترشح ہو رہا ہے یعنی اگر اس بات پر ایمان نہیں لاتے تو اب کون سی بات اس سے زیادہ واضح اور دلوں میں گھر کرنے والی ہو گی کہ اس پر ایمان لائیں گے۔

بعض لوگوں نے بعدہ سے یہ مفہوم سمجھا ہے کہ اس دن کے بعد۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ احتمال ضعیف ہے۔ اس دن تو بہر حال وہ ایمان لائیں گے۔ یہ بات عقلاً بھی واضح ہے اور قرآن بھی اس پر شاہد ہے۔ إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ

لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ اگر مقصود یہ ہوتا تو یہ فرمایا جاتا خلای نفع بعدہ لا یومنون (اس دن کے بعد کس فائدہ کے لیے ایمان لائیں گے) ممکن ہے اس مفہوم کی تائید میں آیت ذیل سے دلیل لائی جائے۔

وَاَنْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۖ فَبِاَىِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ - (الاعراف-۱۸۵)

اور شاید کہ ان کی اجل قریب آ گئی ہو تو اس کے بعد کس بات پر ایمان لائیں گے۔

(اس کے بعد یعنی اجل کے آ جانے کے بعد۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ دلیل واضح نہیں ہے۔ اولاً تو یہاں اجل کا لفظ صریحاً مذکور طور پر اس ہی موجود ہے جس کی طرف ضمیر کو بے تکلف لوٹایا جا سکتا ہے۔ ثانیاً یہاں بھی کچھ ضروری نہیں کہ یہ مطلب لیا جائے۔ سیاق کلام نہایت واضح طور پر ایک دوسری ہی حقیقت کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔ اوپر کی آیت پر غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ان لوگوں کو ملامت کی جا رہی ہے جو کتاب اللہ اور انبیاء و رسل کے منکر ہیں۔ پس اس مضمون کے اعتبار سے وہی تاویل موزوں ہوگی جو ہم نے اختیار کی ہے۔ سلف کا مذہب بھی یہی ہے۔ چنانچہ علامہ ابن جریرؒ فرماتے ہیں۔

"فَبِاَىِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ محمدؐ کی تحذیر و تخویف کے بعد اب وہ کون سی تحذیر و تخویف ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے۔ اگر اس کتاب کی تصدیق سے ان کو انکار ہے تو اب کونسی کتاب ہے جس کی وہ تصدیق کریں گے؟"

بعض دوسرے مفسرین کا بھی یہی مذہب ہے۔ پس اس آیت سے جو ثبوت پیش کیا گیا ہے وہ ہمارے نزدیک بہت زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہے۔

۱۱- آیات کی تاویل اور ان کا نظم

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا میں غائب کو حاضر و مصور کرنے کا وہی اسلوب ملحوظ ہے جو اِنْطَلِقُوْٓا میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ۔ میں دو تاویلوں کا احتمال ہے۔ ایک یہ کہ اس کو پچھلے خطاب سے بالکل متصل مانا جائے اور ان آیات کے سیاق و مفہوم میں لیا جائے جو اکثر آخرت کی نعمتوں کے ذکر کے بعد وارد ہیں۔ مثلاً فرمایا:

اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ۔ (الدھر-۲۲)

یہ تمہارے لیے بدلہ ہے اور تمہاری کوشش مقبول ہوئی۔

دوسری جگہ ہے:

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِىْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (الزخرف-۷۲)

اور یہ جنت ہے جس کے تم وارث ہوئے ہو اپنے عمل کے بدلے میں۔

دوسری یہ کہ اس کو التفات اور خطاب کے مفہوم میں لیا جائے اور اس کے نظائر بھی قرآن مجید میں بہت ہیں اور نظم ہی پر اس کو محمول کرنا زیادہ بہتر ہے۔

آیت ذیل یہاں بطور مقابلہ ہے یعنی جب کہ نیکو کاروں کو ان کے اعمال کے صلہ میں نعمتیں مرحمت ہوں گی تو ان

منکروں کے لیے عذاب ہوگا۔ اور یہ عذاب ان کے لیے دہرا ہو جائے گا۔ ایک طرف تو عذاب کی اذیت ہوگی۔ دوسری طرف مومنین کی کامیابی پر حسرت و اندوہ یعنی یہ غم بالائے غم ہوگا۔

كُلُوْا وَتَمَتَّعُوْا قَلِيْلًا اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ اس آیت میں کافروں سے خطاب ہے اور اس میں بلاغت کے بہت سے پہلو اکٹھے ہو گئے ہیں۔

۱- اوپر مومنین کی نعمتوں کا ذکر تھا۔ پس اس آیت میں گویا اس کی مقابل حالت کا بیان ہوا۔

۲- اس میں جلد عذاب آنے کی دھمکی ہے۔

۳- دنیا کی اس حقیر پونجی پر ان کو جو گھمنڈ ہے اس پر ملامت ہے۔ گویا ان کے لیے عذاب مقدر ہو چکا ہے۔ صرف تھوڑی سی مہلت دے دی گئی ہے کہ جو کھانا پینا چاہتے ہیں کھا پی لیں بالآخر تو ان کو عذاب میں پڑنا ہی ہے۔

۴- اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ روز جزا پر دلیل ہے، یعنی چند روز کھا پی لو، تمہارا مجرم ہونا طے پا چکا ہے۔ پس ضروری ہے کہ ایک دن باز پرس اور سزا کا آئے۔ ایک دوسری جگہ اس مضمون کی وضاحت ہو گئی ہے۔ قُلْ تَمَتَّعُوْا فَاِنَّ مَصِيْرَكُمْ اِلَى النَّارِ۔ کہہ دو، چند روز مزے کر لو، کیونکہ تمہارا ٹھکانا جہنم ہے۔ اس کے بعد آیت آئی ہے، جس سے مقصود وَیل کی شدت اور قطعیت کا بیان ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ ارْكَعُوْا لَا يَرْكَعُوْنَ یہ اپنی دونوں تاویلوں کے اعتبار سے اِنَّكُمْ مُّجْرِمُوْنَ کی تفصیل ہے۔ کیونکہ جو دنیا میں اپنے پروردگار کے حضور نہ جھکا وہ حقیقت میں بہت بڑے جرم کا مرتکب ہوا۔ اولین فریضہ خدا کے سامنے پستی و فروتنی کا اظہار اور سب سے بڑی معصیت خدا سے استکبار ہے اور یہ تکذیب و انکار کا لازمی نتیجہ ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَلَا صَدَّقَ وَلَا صَلّٰى ۙ وَلٰكِنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ۙ ثُمَّ ذَهَبَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ يَتَمَطّٰى ۙ اَوْلٰى لَكَ فَاَوْلٰى ۔

پس نہ تصدیق کی اور نہ نماز پڑھی بلکہ انکار کیا اور منہ موڑا پھر اکڑتا ہوا اپنے لوگوں کی طرف چل دیا۔ تیرے لیے ہلاکی ہے۔ پھر ہلاکی ہے۔

دوسری تاویل کے اعتبار سے مضمون یوں ہوگا کہ پہلے فرمایا کہ تم آج مجرم ہو، اس کے بعد فرمایا کہ ان کا جرم قیامت کے دن کھلے گا جب وہ جھکنے کے لیے بلائے جائیں گے لیکن جھک نہ سکیں گے۔ اس کے بعد آیت ویل کا مقصد یہ ہوگا کہ یہ ویل ان کے خدا کے آگے نہ جھکنے کا نتیجہ ہوگا۔ اور یہ مضمون آیت کی دونوں تاویلوں کے لحاظ سے بن جائے گا۔

فَبِاَىِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ یہ خاتمہ کی ایک جامع آیت ہے جس نے ان تمام مضامین کی طرف انگلی اٹھا دی ہے جو از قبیل دلائل و از قسم ترغیب و ترہیب اوپر بیان ہوئے تھے اور استفہام کے اسلوب میں یہاں متعدد نکتے پوشیدہ ہیں۔

۱- اس سے اس کلام کی عظمت و منزلت اور تبلیغی اعتبار سے اس کی جامعیت واضح ہو جاتی ہے۔

۲- ان کے ایمان کی طرف سے ناامیدی مترشح ہوتی ہے۔

۳۔ ان کے انکار پر ملامت ہے۔

پھر آیت کے موقع سے یہ بات بھی نمایاں ہوتی ہے کہ اتمام حجت کے بعد اب یہ داعی کی طرف سے آخری بات ہے۔ اس اسلوب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں۔ مثلاً آخر سورۂ طارق میں فرمایا:

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا وَّاَكِيْدُ كَيْدًا فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا۔

شاہد ہے آسمان پرنگار اور زمین پرشگاف کہ یہ دوٹوک بات ہے اور ہنسی مسخری نہیں ہے۔ وہ چل رہے ہیں ایک چال، میں چل رہا ہوں ایک اور چال، سو چھوڑ دے کافروں کو ذرا دیر کو۔

سورۂ زخرف کے آخر میں ہے:

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ

پس ان سے درگزر کرو اور کہو سلام وہ جلد جان لیں گے۔

اسی اسلوب کے مطابق خاتمہ کی آیت سے یہاں بھی واضح ہے کہ جب وہ اس بات پر ایمان نہیں لاتے تو اب وہ کس چیز پر ایمان لائیں گے؟ پس ان کو چھوڑ دو۔ تھوڑے دن کھا پی لیں اور مزے اٹھا لیں۔

مُكَذِّبِيْنَ سے متعلق ہم نے اوپر تاویل کے جو پہلو بیان کیے تھے، خاتمہ کی آیت نے اس کے دوسرے پہلو کو واضح کر دیا کہ یہی منکر ہیں جو اللہ کے کلام کا انکار کرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ دراصل قرآن کا انکار نتیجہ ہے ان کے انکار قیامت اور نماز اور بندگی سے بے پروائی کا۔ اور یہ مضمون قرآن مجید میں بار بار بیان ہوا ہے۔ اور اس کے بعض شواہد دوسری فصل میں بیان ہوئے ہیں۔